ناہید ناز
پی ایچ ڈی سکالر(اُردو)
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

انیس ناگی کے افسانوی ادب میں نفسیاتی شعور

Dr. Anees Nagi (1939-2010) was known as a celebrated researcher, critic, fiction writer, poet, translator and column writer. He was a well-read and knowledgeable person. His vast study of the modern French philosophical writers, poets and critics like Jean Paul Sartre, Albert Camus, Arthur Rimbaud, John Perse gave a philosophical taste to his writings. He was genuinely considered as a modernistic writer and his fiction reflects most of the modern theories and ideas. His fiction focuses human life, ideas, emotions and psychological approach of a common man of society. This article is an attempt to study the psychological consciousness in Anees Nagi's fiction.

تخلیق ،فرد کے لاشعور کا فنی اظہار ہے۔ یہ فرد کے داخل میں پوشیدہ احساسات،محرکات ، ہیجانات اور جذباتی نا آسودگیوں کی خارجی سطح پر قابلِ قبول صورت اوران کے ارتفاع (sublime) کا ادبی روپ ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> تخلیق کار کا اہم ترین نفسیاتی محرک تخلیق کار کی نا آسودگی ہے۔ یہ جنس بھی ہوسکتی ہے اور غیر جنس بھی ۔ نا آسودگی کا یہ احساس جذباتی سطح پر ظہور پذیر ہوسکتا ہے یا پھر ذہنی الجھنوں کی صورت میں ۔فرد نارمل ہو یا ابنارمل، نا آسودگی کا اظہار بہ ہرصورت کسی نہ کسی روپ میں ضرور ہوتا ہے ۔اس کے ہاتھوں بعض نارمل افراد ابنارمل بنے جب کہ ابنارمل لوگوں نے تخلیق سے آسودگی پائی ۔[1]

ادب اور نفسیات کا تعلق اتنا ہی پرانا ہے جتنا بہ ذاتِ خود ادب ۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ادب میں شعور ،تحت الشعور اور لاشعوری محرکات کا سراغ، سگمنڈ فرائیڈ :Sigmund Frued (۱۸۵۶ء-۱۹۳۹ء) کے نظریات کی صورت میں لگایا گیا؛ جنہیں بعد میں کارل گستاوَ یونگ :Carl Gustav Jung(۱۸۷۵ء-۱۹۶۱ء)،الفریڈ ایڈلر :Alfred Adler(۱۸۷۰ء-۱۹۳۷ء) اور نیو فرائیڈین جیسے ارنسٹ جونز:Enrst Jones(۱۸۷۹ء-۱۹۵۸ء)، ہربرٹ ریڈ:Herbert Read(۱۸۹۳ء-۱۹۶۸ء)،لائینل ٹرلنگ:Lionel Trilling(۱۹۰۵ء-۱۹۷۵ء)، ایڈمنڈ ولسن :Edmund Wilson(۱۸۹۵ء-۱۹۷۲ء)،کینتھ برک :Kenneth Burke(۱۸۹۷ء-۱۹۹۳ء) اور ماوڈ باڈکن:Maud Bodkin(۱۸۷۵ء-۱۹۶۷ء) جیسے نفسیات دانوں اور نفسیاتی ناقدین نے پروان چڑھایا۔

فرائیڈ کا نظریہ جنس اور تحلیلِ نفسی ، ادب میں تخلیق کار کی داخلی شخصیت کی عکاسی اور ترجمانی کی صورت میں پروان چڑھا اور ادب میں گہرائی ، معنویت، تخلیق اور تخلیق کار کی باہمی پیوستگی اور انسلاک کا کھوج لگایا گیا۔ بعدازاں کارل گستاوَ یونگ کے نظریہ اجتماعی لاشعور(collective unconsciousness) اور نختمثال(archetype) سے ادب میں معاشرتی اور ثقافتی عناصر کے اثرات کا سراغ لگایا گیا۔ ایڈلر کے نظریہ احساسِ کمتری(inferiority complex)اوراحساسِ برتری(superiorty complex) سے فرد کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی سعی کی گئی۔ یوں ادب انسان مرکزیت کی طرف لوٹ آیا۔ مثالیت پسندی اور مافوق الفطرت عناصر کی فوقیت کم ہوئی ۔ انسان مرکزِ کائنات ہی بنا اور مرکزِ ادب بھی۔ نفسیات براہ راست انسان کے مطالعے کا علم ہے لہٰذا ادب پر اس کے اثرات دُوررس اور نمایاں ہیں۔ ادب میں فکری سطح پر نظریہ جنس ، تحلیلِ نفسی ، لاشعور، اجتماعی لاشعور، احساس کمتری، احساسِ برتری، جبلتِ مرگ، جبلتِ حیات، خبطِ عظمت، نظریہ نختمثال (Archetypes)، نقاب (Persona)، تصویر زن(Anima) اور تصویر مرد (Animus) سایہ یا ظل (Shadow)اور مادرِ عظمٰی (Great mother) جیسے نظریات کارفرما ہوئے؛ جب کہ فنی سطح پر شعور کی رو ، آزاد تلازمہ خیالات ،علامتیت ، تجریدیت ،فلیش بیک، فلیش فارورڈ اور خودکلامی جیسی تکنیکوں نے بار پایا۔

انیس ناگی کے افسانوی ادب میں نفسیات کے جن سمتوں نے نمو پائی ان میں کارل گستاوَ یونگ کا اجتماعی لاشعور ، نقاب، مادرِ عظمٰی کا سلبی پہلو جب کہ سگمنڈ فرائیڈ کا نظریہ جنس بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ اجتماعی لاشعور کے ڈانڈے انسانی ذہن کی وراثتی ساخت سے جڑے ہیں ۔ انسان صدیوں پر محیط تاریخی، ثقافتی، اور تمدنی کیفیات، واقعات اور تمثالوں کو لاشعوری طور پر اگلی نسل تک منتقل کرتا جاتا ہے۔ اجتماعی لاشعور، اجتماعی معاشرتی تجربات سے ماخوذ ہوتا ہے۔ بچہ جس معاشرتی ماحول میں پیدا ہوتا ہے اس کے مخصوص تمدنی ،تہذیبی ،حیاتیاتی اور کرداری خصائص اس کی شخصیت کا جزو بنتے جاتے ہیں ۔گویا یہ بچہ اپنے مخصوص ماحول کے خصائص کا امین بھی ہوتا ہے اور نمائندہ بھی ۔اجتماعی لاشعور کی تعمیر میں قرنوں پر محیط تجرباتی مواد کا ذخیرہ شامل ہوتا جاتا ہے جو فرد کی ذہنی ساخت کی تعمیر میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے ۔ اجتماعی لاشعور کے نظریے نے فرد کے معاشرے کے ساتھ نسل در نسل کے ذہنی تعلق اور نفسیاتی ورثے کے خدوخال واضح کیے ؛جہاں فرد کی شخصیت اپنی ذات تک محدود نہیں بلکہ معاشرتی پس منظر، تاریخی واقعات اور نسلی وراثتی تانے بانے سے منسلک ہے۔اجتماعی لاشعور کے نظریے نے ادب اور فن پر نا قابلِ تردید اثرات مرتسم کیے۔ موضوعات میں فرد اور معاشرہ باہمی ارتباط اور انسلاک کے رشتوں میں جڑ گئے۔تاریخی اور جغرافیائی ماحول بھی ادب پر اثر انداز ہوا۔ ظاہر ہے فرد اپنے معاشرتی ماحول سے تجربات پا کر ہی پلتا بڑھتا ہے؛ لہٰذا فن اور اظہار کے موضوعات اور سانچوں میں اس کا اظہار یقینی ہو جاتا ہے۔

انیس ناگی کے افسانوی ادب میں اجتماعی لاشعور، اس کے اپنے معاشرے کے تہذیبی ، تاریخی ، ثقافتی ، ذہنی

اور فکری ورثے سے پھوٹتا ہے۔ ہندوستانی باشندوں کی ذہنی ساخت میں قرنوں پر محیط تاریخی، ثقافتی اور سیاسی عوامل اور واقعات شامل ہیں جنہوں نے دیگر شعبہ ہائے زیست کے ساتھ فن وادب پر بھی دیرپا اثرات مُرتسم کیے ہیں۔ انیس ناگی کے افسانوی ادب میں تشویش، خوف، اضطراب، بے بسی، مایوسی، احساسِ تنہائی، نراج، غم اور غصے کے ملے جلے رویے، ہندوستانی عوام کے اجتماعی لاشعور کا آئینہ ہے جو نسلِ انسانی کی ابتدائی تاریخ سے حال تک مسلسل بیرونی استبداد کا شکار رہے ہیں۔ مشرق، بالخصوص ہندوستانی قوم کی دروں بینی (introwardness) ان کے اجتماعی لاشعور کا غالب رجحان ہے جو ناول دیوار کے پیچھے کے پروفیسر (ناول کا مرکزی کردار) کی خودکلامی میں نمایاں ہے؛ جب وہ محکومی اور بے بسی کو اپنے وجود کی وراثت قرار دیتا ہے؛ ملاحظہ کیجیے:

> فقط تکمیل کی حسرت، مجبوری کا سب سے بھیانک روپ، زندگی نے مجھے کیا دیا ہے، حساب برابر ہوا، جسمانی ہیئت؟ ہاہا۔ یہ ان نوخیز جراثوموں کا کرشمہ ہے جو میرے وجود میں منتقل ہوکر نئے جراثوموں میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ میری وراثت کے لیے کس نے جانشینی کا دعویٰ کیا ہے؟ احمقوں نے جلد بازی سے کام لیا ہے! لالچ نے ان کی روشنی چھین لی ہے۔ لو میری موجودگی ہی میں وراثت کا صندوق کھولو: نراج، ابن الوقتی، محکومی اور خشک فوطے!! [۲]

یہ نراج، مایوسی اور بے بسی تیسری دنیا کے اجتماعی لاشعور کا حصہ ہے۔ ماضی سے غم زدہ، حال سے بے حال اور مستقبل سے مایوسی اور بے یقینی کے رویے اس بدقسمت قوم کے مقدر میں لکھ دیے گئے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ردِعمل کی بجائے مفاہمت یا فرار کے رویوں سے زندگی گزارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دیوار کے پیچھے کے پروفیسر کے یہ جملے تیسری دنیا کے اجتماعی لاشعور کے ترجمان ہیں:

> کس نے یہ جہنم تعمیر کیا ہے؟ میرے حواس سٹھیا گئے ہیں، فرد اپنی تمام تر آزادانہ فعلیت کے باوجود نامساعد حالات میں مجبوری کی تصویر ہے، اصل مسئلہ فرد اور اجتماع کے متناسب ربط کا ہے کہ ایک مخصوص قسم کے معاشرے سے فرد کس قدر مفاہمت کرسکتا ہے؟ جہاں اجتماعی سطح پر منفعیت کا دور دورہ ہو، وہاں قطع تعلقی ضروری ہے۔ شک، بے یقینی اور بداعتمادی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مَیں نے ایک مشکوک معاشرے کے رحم سے جنم لیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میری دیانت پر شک کیا جائے، فلسفہ کے میدان میں شک دریافتوں کی کلید ہے لیکن جب حاکم ومحکوم میں شک اور بدگمانی ابھرنے لگے تو ساری فضا آلودہ ہوکر ہر چیز کی معنویت کو مشکوک بنادیتی ہے۔ [۳]

بیرونی اقوام کے ہاتھوں، نسل درنسل غلامی نے، اہلِ ہند کے باطن سے خوداعتمادی، بے باکی اور بے خوفی جیسی کرداری اوصاف کا خاتمہ کرکے ان میں چاپلوسی، خوشامد، جھوٹ اور فریب جیسے منفی عوامل ڈال دیے ہیں۔ یہ منفی

کرداری عوامل مِن حیث القوم قبولیت کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ناول دیوار کے پیچھے میں ہمارے عدالتی نظام پر چوٹ کی گئی ہے اور عدالت میں جھوٹی گواہیوں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے ۔ ناول میں پیشہ ور جھوٹے گواہوں کے بیانات، جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کا ناپا تلا انداز، معاشرے کی کایا پلٹ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔جب پروفیسر کو جھوٹی گواہی کے لیے بلایا گیا تو اس کے من کی سچائی نے اسے جھوٹی گواہی دینے سے روکا لیکن معاشرتی مصلحتیں اس کے اندر کے خیر پر غالب آگئیں؛ پروفیسر کے یہ مکالمے قابلِ غور ہیں:

> مَیں دوسروں سے مختلف نہیں ہوں، جعفر اور صادق ایک مدت سے اس چار دیواری میں یہی کام کرتے چلے آرہے ہیں، وہ تو ان تمام کمروں میں ہزاروں مرتبہ نادیدہ یا فرضی واقعات کو دیدہ اور حقیقی واقعات کے طور پر بیان کر چکے ہیں، ان کا سر کبھی نہیں چکرایا، ان کا تمسخر کسی نے نہیں اڑایا، میرے جھوٹ اور سچ بولنے سے کیا فرق پڑتا ہے، ننگوں میں ایک اور ننگے کے اضافے سے بے حیائی نہیں پھیلتی ۔مَیں کوئی معیار نہیں ہوں کہ میرے حوالے سے اچھے اور برے کا تعین کیا جائے کیونکہ میرے تمام عوامل اچھائی اور برائی سے باہر سرزد ہوئے ہیں۔کون دروغ گو نہیں ہے۔[۴]

خوف ،ہمارے اجتماعی لاشعور میں سرایت کر چکا ہے ۔ ہندوستان کی سرزمین مسلسل جنگ وجدل کا شکار رہی ہے۔اہلِ ہند نے نیزوں اور تلواروں سے توپوں اور بموں کے وحشت ناک مناظر دیکھے ہیں۔نسل در نسل حالاتِ حرب میں پلنے والے ہندوستانیوں کے لاشعور میں خوف اس حد تک سرایت کر چکا ہے کہ انہیں ہر پل، اندرونی اور بیرونی قوتوں سے عدم تحفظ کا احساس رہتا ہے۔ناول ایک گرم موسم کی کہانی میں برطانوی افواج کے مقابلے میں ہندوستانیوں کا مفاہمتی رویہ، اس خوف کا ردِعمل ہے جن کی مدد سے کم وبیش چار ہزار برطانوی باشندے، ہندوستانیوں کی ہی افرادی قوت استعمال کر کے، ان پر مسلط ہوگئی۔ناول کے، برطانوی فوجی میجر سپنر کے یہ جملے،اس کے احساسِ تفاخر اور ہندوستانیوں کے لاشعور میں خوف کے غماز ہیں:

> یہ بے حد کمزور قوم ہے،خوف ان کی زندگی ہے۔اگر ان میں ردِعمل کی صلاحیت ہوتی تو آج ہم کلکتہ سے پنجاب تک سب کو روندتے ہوئے نہ پہنچتے ۔[۵]

مسلسل محکومی نے تیسری دنیا کے افراد میں احساسِ کم تری کو یوں فروغ دیا ہے کہ ہم تقلیدِ مغرب میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔جھوٹا پندار اور تقلیدِ مغرب ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن چکا ہے۔ناول مَیں او روہ کا ہیرو ایشیائیوں کے اجتماعی لاشعور میں مغربی اقوام کی تقلید کے پسِ پشت احساس کمتری کی طرف اشارہ کرتا ہے:''تم لوگ ان کی نقل میں کافی میں دودھ اور چینی ڈالتے ہو۔ہم ایشیائی نقلوں میں خوش رہتے ہیں۔''[۶]

آریاؤں ،عربوں ، افغانیوں، ترکوں اور یورپیوں کی ہندوستان آمد، یلغار، استبداد اور حکم رانی نے اہلِ ہند کو

مسلسل بے سکونی، بے چینی، اضطراب اوران دیکھے ان جانے خدشات کا حامل بنا دیا ہے۔ناول مَیں اور وہ کے ہیرو کے یہ جملے انہی کیفیات کے غماز ہیں:

> وہ گدھا سفید فام ہے۔ اسے کیا علم کہ میری نسل خطرے میں پلی ہے۔ کبھی اپنوں سے اور کبھی دوسروں سے اور ہندوستان کے سپاہی ابھی تک خندقوں میں بیٹھے دشمن کے منتظر ہیں۔ دو جنگیں گزر چکی ہیں۔ان کی بندوقوں میں زنگ اتر آیا ہے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔[۷]

ناول پتلیاں کے خبیث زدہ کرداروں کی بے بسی، معاشرے کے مجموعی خبیث کی غماز ہے جو داخلی اور خارجی عدم مطابقتی رویوں کی بنا پر معاشرے پر بوجھ بن کر جیتے ہیں یا پھر منفی رجحانات کا شکار ہو کر معاشرتی تخریب کا باعث بنتے ہیں۔ یہ نفسیاتی عدم توازن کے مختلف روپ ہیں جو ہر فردِ معاشرہ میں کسی نہ کسی سطح پر موجود رہتے ہیں۔جمیل (ناول کا مرکزی کردار) کے نفسیاتی عدم توازن پر مبنی یہ جملے معاشرے کی مجموعی نفسیاتی صورتِ حال پر طنز ہے:"مائی گاڈ، پروین! ہم نفسیاتی طور پر کتنی صحت مند قوم ہیں کہ ہمیں کوئی نفسیاتی بیماری نہیں ہے۔"[۸]

معاشی عدم توازن معاشرے کا وہ ناسور ہے جہاں طبقاتی امتیازات میں گھرے افراد معاشرہ ہوسِ زر کی طلب میں دیوانہ وار دوڑتے دوڑتے عدم توازن کی حد پار کر چکے ہیں۔ زر مرکز رویوں نے انسان سے اعلیٰ اخلاقی آدرشیں چھین لی ہیں۔ جارحیت اور داخلی اضطراب ہمارے معاشرے کے اجتماعی لاشعور کا اہم جزو ہے۔انیس ناگی نے ناول پتلیاں میں جگہ جگہ اس صورتِ حال پر طویل بیانات قلم بند کیے ہیں؛ یہ بیان ملاحظہ کیجیے:

> مرنا آسان ہے، جینا مشکل، خاص طور پر ان خطوں میں جہاں زندگی ایک بارود خانہ ہو، جہاں ہر ذی نفس دوسرے کو فریب دینے کے لیے ہر وقت تیار ہو، جہاں اضطراب میں رہنا ایک دائمی صورتحال ہو، اضطراب ظاہر ہے، زیادہ باطن میں ایک کیڑے کی سی خاموشی سے لہو پیتا رہتا ہے، پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ آدمی اندر سے منہدم ہو جاتا ہے اور ظاہری طور پر وہ زندگی کے میلے میں گھومتا پھرتا ہے۔[۹]

ناول قلعہ ،معاشرے کی مجموعی بے حسی، ہوسِ زر، بدعنوانی اور استحصالی رویوں کی علامت کے طور پر ابھرا ہے ۔ دارا (ناول کا مرکزی کردار) معاشرتی حالات سے مجبور ہو کر جبر واستحصال کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ ناول کے دیگر ضمنی کردار بھی لالچ، استحصال اور استبداد کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔محکمہ بحالیات میں ناجائز ذرائع سے کلیمز جمع کرا کے زمین حاصل کرنے کے چکر میں قانون اور اخلاق کی جس طرح دھجیاں بکھیری گئی ہیں وہ ہمارے اجتماعی لاشعور میں موجود حرص اور بد دیانتی کا آئینہ ہے۔ انیس ناگی کے فن میں فرد کے انفرادی خوف اور تشویش پر مبنی رویے، اجتماعی صورتِ حال میں ڈھل جاتے ہیں جو نسل در نسل کے تاریخی، تہذیبی، عسکری اور سیاسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے۔

دورِ جدید کے مشینی دور کے تقاضوں سے عہدہ براہ ہونے کے لیے افرادِ معاشرہ کو اپنے چہروں پر نقاب اوڑھنے

پڑتے ہیں؛ایک چہرے پر کئی چہرے سجانے پڑتے ہیں تا کہ دورِ جدید کے تیز رفتار ذہنوں کے معیار پر پورا اترا جا سکے۔نقاب (Persona) مراد:

> Persona(or mask) is the outward face we present to the world. It conceals our real self and Jung describes it as the 'conformity' archetype'. This is public face or role a person presents to others as someone different to who we really are (like an actor).[۱۰]

نقاب یا روپ، مثبت بھی ہوتا ہے اور منفی بھی ؛ چوں کہ فرد کو معاشرے میں مختلف اوقات کار میں مختلف معاشرتی تقاضے نباہنے پڑتے ہیں۔معاشرتی مطابقت اختیار کرنے کے لیے فرد جو روپ دھارتا ہے اور جبلی تقاضوں کو دبا کر پیچھے کر دیتا ہے تو اس کا یہ نقاب مثبت ہوتا ہے ؛ جہاں اس کا ناشائستہ کردار دوسروں کے لیے نا قابلِ برداشت ہو، وہاں بھی اسے اپنے آپ کو قابلِ قبول بنانے کے لیے رُوپ دھارنا پڑتا ہے۔روپ یا نقاب کا منفی رجحان وہاں ابھرتا ہے جب وہ دوسروں کو دھوکہ دہی کے لیے یا اپنے مفادات کی برآوری کے لیے چہرہ در چہرہ کا عمل دہراتا ہے؛ یہاں اس کا نقاب منفی نوع کا حامل بن جاتا ہے۔

انیس ناگی کے افسانوی ادب میں کردار، معاشرتی تعامل کے نتیجے میں روپ بہروپ کا حامل ہوتے ہیں۔ناول **دیوار کے پیچھے** کے پروفیسر کی ملازمت سے برطرفی کے بعد اس کے اہلِ کنبہ اور دفتر کے اہل کاروں کے متغیر رویے، نقاب کی مثال ہے:

> بوڑھی ملازمہ تنخواہ اور پیشگی کا مطالبہ کر چکی ہے، سب اپنے واجبات کا منہ کھولے انتظار کر رہے ہیں، یہی لوگ اور ضرورتیں اس وقت تک کتنی معصوم تھیں، جب تک انہیں یقین تھا کہ ان کا مطالبہ پورا کیا جا سکتا ہے اور اب وہ بھیڑیے کی طرح منہ کھولے غرّا رہے ہیں۔[۱۱]

معاشرتی عدم مطابقت کی بنا پر پروفیسر، مایوسی اور اضطراب کا شکار ہو گیا؛ مجبوراً اسے اپنے اوپر نقاب چڑھانے پڑے۔اس نے لمبی زلفوں اور داڑھی میں اپنا اصل چہرہ چھپا لیا۔متعینہ ضابطہء اخلاق سے منحرف ہو کر گشت خرامی کو اپنا شعار بنا لیا۔ معاشرے سے انتقام لینے کے لیے، پروفیسر نے مختلف روپ بدلے، لیکن اسے سکون حاصل نہ ہو سکا۔پروفیسر کی زبانی بولے گئے یہ جملے اس کے Persona کا اعتراف ہے:

> مَیں نے شرافت اور ذلت کے سب بھیس بدلے، اس کے باوجود میں وہ طمانیت حاصل نہ کر سکا جس کی مجھے آرزو تھی، مَیں بے نیل و مرام ایک مشتعل بھکاری کی طرح در بدر مارا پھرتا رہا ہوں، مَیں نے اپنے تحفظ کے لیے ہر قوت سے التجا کی لیکن میرے ساتھ ہر ایک نے دھوکہ کر کے مجھے پیہم لرزے میں زندہ رہنے پر مجبور کیا۔[۱۲]

حفیظ(ناول کا ایک کردار جو مزدور یونین کا لیڈر تھا) ڈبل کراسنگ کے ذریعے مختلف مزدور یونینوں کے مابین وسیلہ بنا، دونوں طرف سے رقم بٹور کر کنبے کی کفالت کرتا رہا۔ یوں اس نے اپنے اوپر اتنے نقاب چڑھائے کہ پروفیسر اس کی اصلیت پہچان ہی نہ سکا۔ یہ جملے حفیظ کے نقاب پر دال ہیں:

> مَیں حفیظ کے اس روپ کے بارے میں سوچ تک نہیں سکتا تھا، اس کا نظریاتی جوش اتنا شدید تھا کہ کبھی گمان تک نہیں گزر سکتا تھا کہ حفیظ وہ نہیں ہے جو نظر آتا ہے۔ اوہ! ہر ظاہرہ حقیقت مسخ ہو چکی ہے۔ حفیظ ایک پوز تھا، سکندر ایک پوز ہے، مَیں خود ایک پوز ہوں، ہم سب حقیقت کی مسخ شدہ شکلیں ہیں۔[۱۳]

ناول صاحباں کا مرکزی کردار ''آکاش'' بھی ماہرِ نفسیات کا نقاب اوڑھے، لوگوں کو علاج کے بہانے دھوکہ دیتا رہا۔ نفسیات کے شعبے میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد عملی زندگی میں ناکامی کی بنا پر سامری کلینک (Occult Centre) کھول لیا؛ کلینک کی دیواروں پر کارل مارکس، بھلے شاہ، حسن بن صباح اور فرائیڈ کے پوسٹر لگا کر لوگوں کو ماہرِ نفسیات، معاشیات اور صوفی ہونے کا چکمہ دیتا رہا۔ ناول پتلیاں میں روپ بہروپ کے یہ سلسلے ملتے ہیں جہاں متوسط طبقے کا ہر فرد اپنے چہرے پر اور چہرے سجانے پر مجبور ہے۔ ہر فردِ معاشرہ، حالات کے خلاف ردِعمل نہ کر پانے کی بنا پر منافقتوں کے لبادے اوڑھے ہوئے ہے۔ ناول میں موجود یہ جملے ملاحظہ کیجیے:

> انسان وہ نہیں ہے جو کچھ نظر آتا ہے، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے باطن کو ظاہر ہونے سے روکتا رہتا ہے کیونکہ اس میں ممنوعہ کی حد توڑنے کا رجحان بڑا قوی ہوتا ہے۔ یہ زندگی بسر کرنے کا ایک سمجھوتہ ہے۔ اس کی تربیت اور اس کے اردگرد کی دنیا رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ یہ کش مکش ساری عمر چلتی رہتی ہے۔ وہ کرنے اور نہ کرنے کے تضاد میں رہتا ہے۔[۱۴]

جمیل (ناول کا مرکزی کردار) اپنی ازدواجی زندگی میں خود کو ایمان دار اور باوفا ثابت کرنے کے لیے خود بھی نقاب چڑھائے ہوئے تھا۔ اگرچہ ''راحت'' نامی نوجوان مطلقہ سے اس کے تعلقات تھے لیکن گھر والوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات نباہنے کے لیے اس نے اپنی ذات کے گرد ایک ہیولیٰ بنا رکھا تھا۔ بطور ماہرِ نفسیات اسے علم تھا کہ:

> آدمی کے لیے نئی عورت کے لیے خواہش کبھی ختم نہیں ہوتی، وہ سب کچھ اپنے اندر دبا کر رکھتا ہے اور صرف اپنے معاشرتی منصب کے عکس کو بحال کرنے کے لیے ایک جعلی زندگی بسر کرتا ہے۔[۱۵]

ناول ناراض عورتیں، عورت کے نقاب کے مختلف زاویے پیش کرتا ہے جہاں ہر طبقے، رنگ، نسل، ذات اور پیشے سے منسلک عورت کے بہروپ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ طالبہ، وکیل، مؤکلہ، طوائف، بزنس وومن، گرہستن اور گھر کی ملازمہ؛ الغرض ہر معاشرتی عمل میں عورت اپنے اوپر مضبوط نقاب چڑھائے رکھتی ہے۔ عرفان صاحب (ناول کا مرکزی کردار) کی زبانی عورت کے روپ کے حوالے سے انیس ناگی اپنا مؤقف بیان کرتے ہیں:

عورتیں اپنے آپ کو کیموفلاج کرنے میں ماہر ہوتی ہیں اور معصومیت اور بے بسی ان کا روپ ہوتا ہے۔[۱۶]

سلما (ناول کا ایک نسوانی کردار) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> سلما سے بچ کر رہیں، حوا کے دو چہرے ہوتے ہیں، ایک نے مسکرا کے کہا۔نہیں تین چہرے۔آپ نے شاید شرلے میکلین کی فلم three faces of eve دیکھی ہے۔[۱۷]

شمی (ناول کا ایک اور نسوانی کردار، بزنس ومن) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور۔اس کے تین روپ ہیں۔ پہلا روپ ایک مظلوم عورت کا ہے جس کا خاوند عین جوانی میں اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔اس کا دوسرا روپ ایک ہنس مکھ اور خلیق بزنس ومن کا ہے جو صاف ستھرا بزنس کرتی ہے اور اصولوں پر چلتی ہے۔ اس کا تیسرا روپ اس وحشی عورت کا ہے جو دن میں تین مرتبہ سیکس کرتی ہے اور ویاگرہ کھاتی ہے۔[۱۸]

ناول قلعہ کا مرکزی کردار، دارا بھی عورت کے روپ بہروپ کا ڈسا ہوا ہے۔ وہ عورت کے ساتھ ہم دردی کر کے اس کے چنگل میں پھنس گیا حتیٰ کہ زن بیزار ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:

> سب عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں جو وہ باہر سے ہوتی ہیں، اندر سے بالکل مختلف ہوتی ہیں، ان کے ساتھ محدود تعلق ہونا چاہیے۔[۱۹]

افسانہ ''چاندرات'' کا مولوی بھی دولخت شخصیت (dual personality) کا مالک ہے؛ وہ بدکردار اور منافق شخص ہے۔افسانے میں شعور، تحت الشعور اور لاشعور کو تین بھائی قرار دے کر مولوی کا باطن دکھایا ہے۔ وہ اپنی باتیں ان دونوں پر ظاہر نہیں ہونے دیتا لیکن تحت الشعور اور لاشعور کو خبر ہو جاتی ہے۔ وہ شعوری طور پر اخلاقی خباثتوں میں مبتلا ہے؛ لیکن نماز بھی باقاعدگی سے پڑھتا ہے۔وہ جوا کھیلتا ہے لیکن جب کہانی لکھتا ہے تو اس کردار کو، جس کا وہ خود خالق ہوتا ہے، جواری بنا دیتا ہے۔گویا اپنی خباثت کو کرداروں میں ڈھال کر اپنے گناہوں سے بری الذمہ ہو جانا چاہتا ہے۔ وہ پرائز بانڈز خریدتا ہے تاکہ راتوں رات امیر ہو جائے۔وہ ہمسایہ کی بیوی پر بری نظر رکھتا ہے، دوربین لگا کر اس کی کھڑکی میں دیکھتا ہے، اذان سنائی دے تو وضو کر کے نماز پڑھنے لگ جاتا ہے۔متضاد رویوں کا مالک یہ شخص، نفسیاتی عدم توازن کا شکار ہے؛ جو بہ یک وقت خیر و شر کا حامل ہے۔اس افسانے میں نقاب (Persona) کا موثر اطلاق ملتا ہے ۔افسانہ ''سایہ'' میں بھی نقاب کو دورِ حاضر کی معاشرتی ضرورت قرار دیا گیا ہے۔ ایک دفتری اہل کار جو داخلی اضطراب کا شکار ہے اور سکون حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کے ٹوٹکے آزماتا ہے۔ بظاہر پرسکون، مطمئن اور باوقار نظر آنے والا یہ دفتری اہلکار داخلی طور پر معاشرے کے نظام کے خلاف آتش فشاں کی طرح کھول رہا ہے۔اس نے داخلی احتجاج کو بہ مشکل روک رکھا ہے۔اپنی دوہری شخصیت سے وہ خود بھی آگاہ ہے؛ یہ جملے ملاحظہ کیجیے:

میری دوسری زندگی بالکل شخصی ہے اس کے بارے میں میرے سوا کسی کو علم نہیں ہے کہ میری سنجیدہ شخصیت کی کھال کے نیچے کس قسم کا لاوا چھپا ہوا ہے۔ یہ میرے خیالوں کی زندگی ہے جسے میں اپنی دوسری زندگی سے خلط ملط نہیں ہونے دیتا۔مَیں کافی عرصے سے نیکی کے راستے پر چلا ہوں جو بے ثمر ثابت ہوئی ہے ۔مَیں اکیسویں صدی میں داخل ہونے والا مضطرب شخص ہوں جو اپنی نیکی کا اجراس دنیا میں چاہتا ہے۔اوہ! نیکی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔[۲۰]

اس نے نہ صرف اپنی دوہری شخصیت کا اعتراف کیا ہے بلکہ اس کے مطابق، پورا نظام ہی نقاب اوڑھے ہوئے ہے۔ بظاہر متوازن اور راست نظام کے پسِ پشت استبدادی قوتوں کی اجارہ داری ہے جو اسے کٹھ پتلی کی طرح، انگلیوں سے نچا رہی ہے۔ بظاہر سب کچھ سیدھا اور واضح ہے، بہ باطن بے بسی اور بے اختیاری ہے؛ جو افرادِ معاشرہ کو مضطرب کیے ہوئے ہے؛ ملاحظہ کیجیے:

مَیں بلی ہوں اور وہ چوہے ہیں ۔انہیں علم نہیں کہ مَیں بھی ان کے لیے ایک چوہا ہوں جو سارا دن لمبی لمبی کاروں اور پجاروں، جیپوں میں سڑکوں کا سینہ کوٹتے رہتے ہیں ۔مَیں بلی نہیں بننا چاہتا لیکن مجھے بنا دیا گیا ہے۔ یہ ایک بھیس ہے جس کے پیچھے مَیں اور پورا ایک نظام چھپا ہوا ہے ۔ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے، اس لیے ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔اگر مَیں اصلی بھیس سے باہر آؤں تو مَیں کچھ بھی نہیں ہوں ۔کچھ بھی نہ ہو کر کس طرح زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔[۲۱]

اس افسانے میں ایک ثقافتی ادارے کی بار بار بندش اور بحالی کا ذکر ہے۔ثقافت،قوم کی شناخت کا وسیلہ ہوا کرتا ہے۔ اس مرکز کی بار بار بندش اور بحالی بحیثیتِ قوم ہماری احساس کمتری اور بے سمتی کی طرف اشارہ ہے۔ ہم اپنی ثقافت کے حوالے سے خود اعتماد نہیں ہیں اور ان اداروں کی ترتیب و تنظیم کے لیے بیرونی امداد کے محتاج ہیں۔

نقاب پر مبنی ایک اور افسانہ ''حکایت ۵'' ہے جس میں حامد (افسانے کا مرکزی کردار) کی شخصیت کے مختلف روپ ایک دوسرے کے تعاقب میں ہیں۔ اسے یہ واہمہ ہے کہ اس کی پرچھائیں ، اس کا پیچھا کر رہی ہیں ؛ اسے آوازیں سنائی دیتی ہیں ۔اپنے پیچھے سائے نظر آتے ہیں۔افسانے کا آغاز ہی معنی خیز جملوں سے ہوتا ہے:

حامد کے پیچھے ایک اور حامد ہے۔

اس کے پیچھے ایک اور حامد ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ان کے علاوہ ایک اور حامد بھی ہو جو ان حامدوں کے بارے میں سوچتا ہو کہ یہ سب ایک دوسرے کا پرتو ہیں یا ان کا سرے سے ہی وجود نہیں ہے اور یہ کسی الجھے ہوئے ذہن کا واہمہ ہیں جو حقیقت سے مفرور ہے اور اپنے آپ کو دوسروں سے جدا کرنا چاہتا ہے۔[۲۲]

افسانہ نگار نے انسانی وجود کو ایک بوتل قرار دیا ہے جس میں ایک جن بند ہے تو نکلے تو کہرام مچا دے۔ انسان کی اصلیت بے شمار نقابوں تلے چھپی ہوئی ہے۔ یہاں تین حامدوں کی تثلیت، دراصل حامد کی شخصیت کے مختلف روپ ہیں جو ایک دوسرے کے تعاقب ہیں۔ایک ہی گردن پر تین چہرے، مختلف فریموں کی عینکیں پہنے ہوئے ہیں جس کا مطلب ہے کہ ایک ہی شخص کا زاویہء نگاہ اور بصیرت کے درجے مختلف ہیں؛ یہ جملے ملاحظہ کیجیے:

> کیا میرے علاوہ اور حامد بھی ہیں؟ کونسا حامد ہے جو اختلاف میں ہے؟ کیا یہ تثلیت کبھی ایک نقطے پر ملے گی ؟ کیا میں ایک ہی لمحے ان تینوں کا چہرہ دیکھ سکتا ہوں؟ تین چہروں پر تین مختلف فریموں کی عینکیں تھیں۔[۲۳]

اسی مرکزی رجحان کی عکاسی، افسانہ ''حکایت۴'' میں بھی ملتی ہے۔ حامد کو آئینے میں اپنا چہرے کے دو عکس نظر آتے ہیں۔ایک چہرہ، دو میں بدل جاتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کئی چہرے نمودار ہو جاتے ہیں۔ یہ چہرے، حامد کی شخصیت کے روپ ہیں جو آئینے میں نمایاں ہو رہے ہیں جب کہ حقیقی زندگی میں نظر نہیں آتے؛افسانے کا یہ منظر ملاحظہ کیجیے:

> اس نے پیچھے ہٹ کر میز کے پہلو میں لگی ہوئی گھنٹی بجانے کے لیے ہاتھ بڑھایا کہ آئینے میں چہرے نمودار ہونے لگے۔ میرا چہرہ تو ایک ہے اور ایک میں سے اتنے چہرے کیسے نکل آئے اور ایک میں سے اتنے چہرے کیسے نکل رہے ہیں۔ اس نے غور سے آئینے کو دیکھا جن میں چہروں کا ایک حاشیہ حرکت کر رہا تھا، یہ چہرے کیوں بگڑتے جا رہے ہیں؟ انسانی چہرے پر حیوانی روپ ہیں۔ یہ میرا مالک ہے لیکن اس کا منہ گلے تک ٹھپا ہوا ہے اور اس کی ناک الو جیسی،نہیں میرا ایک رفیق کا ربھیڑیا بنتا جا رہا ہے۔ وہ لومڑی نہیں،نہیں یہ فریب نظر ہے۔[۲۴]

یہاں افسانہ نگار نے کمال مہارت سے نقاب کی مدد سے انسان کی خباثت، وحشت اور بربریت کو مورد طعن بنایا ہے۔

کارل گستاؤ یونگ کے یہاں مادرِ عظمیٰ کا ختمثال دو صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ ایک ایجابی اور دوسرا سلبی۔ ایجابی پہلو جہاں اپنے اندر قوی ترین محبت، پیار، خلوص اور ہمدردی و قربانی کے عناصر رکھتا ہے وہاں اس کا سلبی پہلو عورت کے وحشی، ظالم، ایذا پسند اور متشدد روپ میں سامنے آتا ہے؛ بقول ڈاکٹر محمد اجمل:

> مادر عظمیٰ وہ ختمثال ہے جو ہر مادرانہ صفات کا حامل ہے اس ختمثال کا سلبی پہلو یہ ہے کہ اپنے اندر کھا جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔۔۔بعض جوان بہت کم ہمت اور کم حوصلہ ہوتے ہیں۔ اس کی بالعموم وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ مادر عظمیٰ کے شکنجے میں جکڑے ہوتے ہیں۔تحلیل نفسی کے دوران ان جوانوں کو خوفناک چڑیلوں کے خواب اور شبیہیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سے بعض جب کسی عورت سے محبت

کرتے ہیں تو بچوں کی طرح ان کی دل جوئی کرتے ہیں اور اس کی رضا جوئی کی خاطر اپنے آپ کو ناکارہ اور اپاہج بنا لیتے ہیں ۔۔۔ پری کہانیوں میں بری پری جو بعض اوقات چڑیل کا روپ دھارتی ہے اور بچوں کو کھا جاتی ہے یا انہیں آگ میں جلانے کی تیاری کرتی ہے، مادر عظمیٰ کا سلبی پہلو ہے۔[۲۵]

انیس ناگی کے ہاں مادر عظمیٰ کے نختمثال کا سلبی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ اس کی وجہ عورت کے حوالے سے انیس ناگی کی لاشعور میں پوشیدہ خوف، نفرت اور مغائرت کے رویے بھی ہو سکتے ہیں۔ انیس ناگی کے ہاں عورت کا کم سے کم تذکرہ یا عورت کو کرداری نقائص اور منفی رجحانات کی حامل قرار دے کر پیش کرنے کا رجحان، ان کی زن بیزاری اور تنافر کا آئینہ دار ہے۔

ناول ناراض عورتیں کا تھیم اور اس میں مندرج عورت کا سلبی رویے، ژونگ کے مادرِ عظمیٰ کے سلبی روپ ہیں۔ یہ ناول عورتوں کے ہجوم سے بھرا ہوا ہے جس میں مختلف شعبوں میں کام کرنے والی عورتیں ہیں۔ وکیل، موکل، مدعی، مدعا علیہ، پیشہ ور جسم فروش، گلیمر گرلز، مطلقہ، خلع یافتہ، یہ سب معاشرے سے ناراض عورتیں ہیں جو معاشرتی حق تلفیوں کی بنا پر بغاوت پر اتر آئی ہیں۔

انیس ناگی نے عورت کی نفسیات کے سلبی پہلوؤں کے حوالے سے اسے مرد مار قرار دیا ہے۔ عورت کا مطمح نظر، مرد کو فریب دے کر اپنی ذات کا تحفظ کرنا ہوتا ہے۔ وہ مرد کو نرغے میں لا کر انکار سے اقرار اور اقرار سے تحفظ کے مراحل طے کرتے ہوئے معصومیت سے اپنا دفاع کرتی جاتی ہے۔ ناول میں ایک کردار ''عبدل'' جو ناہید (عبدل کی محبوبہ) کی بے وفائی کا انتقام، ہر عورت سے لینا چاہتا ہے؛ عورت کو جنسی استحصالیوں کا نشانہ بناتا ہے۔ ناہید کے کردار میں انیس ناگی نے بے وفا، مکار اور چالباز عورت کو پیش کیا ہے۔ عبدل کے یہ جملے عورت کے مکر اور فریب پر روشنی ڈالتے ہیں:

> پیارے پیر بادشاہ! ہر عورت ورکنگ ہوتی ہے۔ جھاڑو دینے والی ہو یا کسی انڈسٹریلسٹ کی بیوی، ان دونوں کی ایک خصلت ہوگی، دیکھنے میں وہ تم کو بالکل مختلف لگیں گی، ہر عورت بنیادی طور پر میسنی ہوتی ہے اور دل کا بھید نہیں دیتی۔[۲۶]
>
> پیر بادشاہ! مجھے نہیں پتہ لیکن عورت کے چلتر بڑے خوفناک ہوتے ہیں۔ مرد کے بغیر وہ نامکمل رہتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کی بدترین مخالف ہوتی ہے، یہ اس کی انا کا مسئلہ ہے، وہ برتری چاہتی ہے۔[۲۷]
>
> شادی شدہ عورتیں خواہ وہ بیوہ ہوں یا مطلقہ، غائت درجہ شاطر ہوتی ہیں۔ وہ جذباتی یورش میں بھی پہلے اپنے نفع نقصان کے بارے میں سوچتی ہیں۔۔۔ عبدل، ہوس کے پتلے، یہ ایک جال ہے، اسی لیے عورتوں سے پرہیز لازم ہے کیونکہ ان سے تعلق تباہی کا پیش خیمہ ہے۔[۲۸]

انیس ناگی کے یہاں عورت کے روپ بہروپ کے سلسلے اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ ان تک رسائی ممکن ہی نہیں ہوتی۔شمی (ناول کا ایک نسوانی کردار) مادرِ عظمٰی کے سلبی پہلو کی حامل ہے جو مختلف اوقات میں مختلف روپ دھارے مرد کو فریب دیتی ہے۔انیس ناگی ،عورت کی نفسیات سے خوب واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن میں عورت کا ہر روپ دکھایا ہے۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے ہاں عورت کا سلبی پہلو، ایجابی کی نسبت زیادہ واضح ، دیرپا اور پراثر ہے۔اپنی خودنوشت ایک ادھوری سر گزشت میں لکھتے ہیں:

یہ بات شاید کچھ عجیب سی لگے کہ عورت، خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتی ہو، اندر سے بے حد متشدد ہوتی ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ مرد کا عورت سے رویہ ایک فاشسٹ کا ہوتا ہے لیکن اس بات کا دوسرا رخ دیکھنا بھی ضروری ہے۔عورت میں بظاہر صبر کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، وہ تشدد کو برداشت بھی کر لیتی ہے لیکن وہ زندگی کو شطرنج کی ایک بازی کی طرح چلاتی ہے، وہ اپنے تحفظ کے لیے گرہستی اور خاندان کا تارِ عنکبوت بُنتی ہے، وہ ہر لمحے مرد کو غیر مرئی طور پر مفلوج کر کے اسے ضرورت، مجبوری، مستقبل، آرام دہ زندگی کے خواب سے مسحور کرتی ہے، اس کا ظاہری روپ تو انسان ایسا ہے لیکن اس کا باطنی اور ذہنی فریم ورک کلھم مختلف ہے۔جنوبی ایشیا کے ممالک میں عورت کی صورتحال کافی المناک ہے۔حالات نے ،تمدن نے اور مذہب نے اس کے اندر ایسی بندشیں پیدا کی ہیں کہ اس کی ذات خواہشوں کا اندھا کنواں بن چکی ہے۔اس علاقے کی عورتیں اقتصادی استحصال کا شکار ہیں لیکن وہ بتدریج اس طرح مرد کا استحصال کرتی ہیں کہ اس احمق کو اپنی بربادی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب زندگی اس کی گرفت سے نکل چکی ہوتی ہے۔[۲۹]

ناول محاصرہ میں بھی عورت کا سلبی پہلو دکھایا گیا ہے جہاں شگفتہ نامی بیوہ اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے مردوں سے ناجائز تعلقات استوار کیے رکھے، بظاہر پردہ پوش، معصوم اور نیکو کار بیوہ ، دروں خانہ کیا کیا گل کھلاتی رہی،انیس ناگی نے شگفتہ کے کردار میں عورت کے چھل کی نقاب کشائی کی ہے جو مادرِ عظمٰی کا سلبی پہلو ہے:

عورت کے حوالے سے انیس ناگی کا نظریہ اسی نوعیت کا ہے جس میں وہ عورت کو شاطر، ناقابلِ فہم اور پیچیدگیوں کا حامل سمجھتے ہیں۔ایک ادھوری سر گزشت میں لکھتے ہیں:

یہاں کی عورتیں بے حد پیچیدہ ہوتی ہیں اور انہیں اپنے عورت ہونے پر بڑا ناز ہوتا ہے۔وہ چاہتی ہیں کہ

مرد کتے کی طرح ان کا تعاقب کرے۔ مَیں تو ایک انسان تھا اور میری انا مجھے ایسا کرنے سے روکتی تھی۔ میرے اردگرد دلڑکے اور لوگ جس پاگل پن سے عورتوں کا تعاقب کرتے تھے یا ان تک رسائی حاصل کرنے کے لیے جتن کرتے تھے، وہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ عورت سے ربط قائم کرنے کے بعد ان کی جس طرح کی شخصیت نمودار ہوتی ہے کہ ایک اچھا خاصا شخص اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ وہ ہمیشہ بدنی خواہش، اچھے مستقبل اور مذہبی اور معاشرتی قیود کے درمیان بڑی شدت سے تلملاتی رہتی ہے۔[۳۰]

انیس کے افسانوی ادب میں فرائیڈ کے نظریہ جنس کا اطلاق بھی ملتا ہے۔ انیس ناگی، جنس کو سماجی تناظر میں دیکھنے کے قائل ہیں۔ دیوار کے پیچھے کا مرکزی کردار پروفیسر شادی کو ایک مہمل ادارہ سمجھتا ہے اور نزہت (پروفیسر کی دوست) کے اس سوال پر کہ ''شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ پروفیسر کا جواب یہ تھا کہ شادی فی زمانہ ایک اقتصادی مسئلہ ہے، یہ کھاتے پیتے طبقے کا مشغلہ ہے۔[۳۱]

یہ انیس ناگی کا یہ نقطہ نظر ان کے افسانوی ادب میں کہیں بحث و مباحثہ کی صورت میں اور کہیں تحلیلی صورت میں ملتا ہے۔ ان کے افسانوی کردار فکری طور پر جنسی انضباط کے خلاف ہیں۔ ناول کا ایک اور نسوانی کردار ''رضیہ'' جو شادی نہ ہو پانے کی بنا پر جنسی کج روی کا شکار ہوئی۔ شکزوفرینیا میں مبتلا ہو کر واہموں کا شکار ہوئی۔ سر درد، جسم میں اکڑن، منہ سے جھاگ، مرگی کے دورے، چیخ چھنگاڑ ایسی علامات ہیں جو جنسی عدم تسکین کی بنا پر ذہنی عدم توازن کی کیفیات میں ڈھل جاتی ہیں۔ رضیہ کی شادی نہ ہو سکی، انتقاماً وہ کوثر (اپنی چھوٹی بہن) کی شادی میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے مرگی کی مریضہ بن گئی۔ رضیہ کے یہ جملے جنسی تشنگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے منفی انتقامی رویوں کے عکاس ہیں:

> وہ قید سے باہر نکلنا چاہتی ہے۔ یہاں سب بدمعاش ہیں، سودا کیا جا رہا ہے۔ تم بے وقوف ہو، تمہیں پتہ نہیں کوثر چوری چھپے عشق کرتی ہے، وہ ناپاک ہے، میں نے اس سے بولنا ترک کر دیا ہے۔[۳۲]

انیس ناگی کا ہیرو، جنسی تشنگی کی بنا پر ذہنی اضطراب اور تنہائی کا شکار ہے۔ انیس ناگی جنسی، خواہش کی تسکین کو معاشرے کے توازن کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے مطابق، اس بنیادی جبلت کی عدم تسکین کی بنا پر معاشرہ اختلالِ ذہنی کا شکار ہو کر تخریبی سرگرمیوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ انسان کی شخصیت میں غصہ، نفرت، وحشت اور پرتشدد رویے، جنسی بے اعتدالیوں کے مظاہر ہیں۔ ناول ایک لمحہ سوچ کا میں رحمان اور شاہد (ناول کے دو کردار) کے مابین یہ جملے ملاحظہ کیجیے:

یار یہ دہشت پسندی اور سیاست ختم کیوں نہیں ہوتی۔شاہد نے قدرے سہمے ہوئے کہا:''یہ زندگی کا حصہ ہے ۔ جب جنسی جبلت پر مہر لگادی جائے تو یہ دہشت اور تشدد میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ یہ بیمار معاشرے کی ایک علامت ہے۔[۳۳]

انیس ناگی کے ناولوں میں مردوزن کے آزاد جنسی اختلاط کی خواہش کا اظہار ملتا ہے۔وہ شادی کے ادارے کے خلاف ہیں جومردوزن کو شرائط کی جکڑ بندیوں میں ڈال دیتے ہیں۔وہ شادی کو مہمل ادارہ کہتے ہیں۔ناول زوال کے یہ جملے، انیس ناگی کے نظریہ جنس کے عکاس ہیں:

اس سوشل نظام میں شادی لایعنی ہے۔جوسماج عورت اور آدمی کو ملنے کی اجازت نہیں دیتا اور ملاقات کے لیے شادی کو شرط بناتا ہے تو اس سماج اور اس شادی اور دونوں پر لعنت ۔[۳۴]

ناول سکریپ بک میں جنسی جبلت کی تسکین اور اس کے لیے شادی جیسے متعینہ سماجی ادارے پر انیس ناگی کے ہیرو کا تبصرہ ملاحظہ کیجیے جو جنس اور اقتصادیات کے کوئی معاہدہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں:

ہمارے مبلغین کی فہم کچھ ڈھیلی ہے، جسم کی خواہش تمام خواہشوں پر حاوی ہوتی ہے۔اس کے اطمینان کا جائز راستہ شادی بتایا جاتا ہے، شادی تو ایک بہت مہنگا پراجیکٹ ہے، یہاں ستر فی صد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرتی ہے، وہ شادی کس طرح کرے؟ اگر وہ اپنے برتن بیچ کر شادی کر بھی لیتا ہے تو پھر شادی کے بعد کھانے کے برتن کہاں سے آئیں گے؟ اس کا مطلب ہے کہ وہ عمر بھر کنوارا رہے اور بہت سے ذہنی امراض میں مبتلا ہو کر معاشرے کو اتھل پتھل کردے لیکن انسان بہت خبیث ہے۔ وہ راستے ڈھونڈ لیتا ہے اور اہل اخلاق اسے برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔شادی انسان کی حیوانیت کو دھوکہ دینے کا ایک مہذب ذریعہ ہے۔[۳۵]

ناول میں اور وہ میں الجزائر میں مختلف ممالک سے بغرض ملازمت آئے ہوئے مختلف لوگوں کے آزاد جنسی تعلقات کا تذکرہ، انیس ناگی کی لاشعور میں دبی خواہش کا اظہار ہے جس کی تکمیل ہمارے معاشرے میں ممکن نہیں ؛لہٰذا انیس ناگی نے اس کے لیے بیرونِ ملک کا پلاٹ بچھایا ہے جہاں معاشرتی پابندیاں اور قانونی گرفت سے آزاد مردوزن، جنسی خواہش کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔رضا اور میڈم غمازی ، نجم اور عائشہ ، قیوم اور مونا صفیہ اور واحد متکلم کے مابین آزاد جنسی تعلقات ،فرائیڈ کے نظریہ جنس کا عملی پیکر ہیں جو اپنی تکمیل کے لیے کسی ضابطے

کو گوارا نہیں کرتے۔ناول میں اور وہ کے یہ کردار کھلم کھلا جنسی روابط میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔مَیں (مرکزی کردار) حسین عورت کو دیکھ کر جذبات کی بھٹی میں دہکنا شروع ہو جاتا ہے۔اس کی آنکھوں کی چمک اسے محصور کیے دیتی ہے لیکن وہ اس کی طرف سے شادی کے مطالبے پر وہ خوف زدہ ہو جاتا ہے یہی خوف اسے عورت سے دُور رکھتی ہے؛ ملاحظہ کیجیے:

نہیں،اس کی آنکھوں میں ایک بلاوا ہے ، اسے میرے سامنے اعتراف کرنے کی ضرورت نہیں، یہ معاملات کسی وجہ کے بغیر شروع ہوتے ہیں اور پھر بعض دفعہ یونہی ختم ہو جاتے ہیں ۔ اس کی شکل اور بدن کا طلسم اس کے ذہن کی تفسیر نہیں ہو سکتی ۔ مجھے اس کا ذہن نہیں چاہیے ۔ مجھے اس کا حسن چاہیے، اس کے بدن کا لمس چاہیے جو میرے سارے حجاب ، ساری رکاوٹیں ، سارے اندیشے مسمار کر دے اور پھر مَیں پہلے آدمی کی طرح ساحلوں پر قدم رکھوں ، پانیوں ، مرغزاروں ، پھولوں ، خوشبوؤں کا لمس پاؤں، نہیں ، یہ خواب ہے، ایک بدن اسی روپ میں قائم رہ کر مٹی میں غروب ہو جاتا ہے۔[۳۶]

یہی واحد متکلم ایک اور جگہ جنس اور جذبات کے مابین جنگ کی داخلی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

مَیں تو اپنے جذبات بسر کر چکا۔ یہ ہیجان بے معنی ہے، بدن کی خواہش کا غلبہ ہے۔مَیں ساری عمر اس کا انکار کرتا رہا ہوں۔ ازدواجی زندگی بدن کی حیاتیات کی جزوی بے کیف تکمیل ہے، خواہش ایک طوفان ہے جسے ایک بدن کی مانوسیت مغلوب نہیں کر سکتی ،نسائی بدن کی ساری تمکنت اور رعنائی اس کے نامعلوم ہونے میں ہے، مانوسیت بے حجابیت ہے جو اسرار کو ختم کر کے لذت کو برہنہ کر دیتی ہے۔[۳۷]

ناول ۳۱۳۔بریگیڈ میں فریدون (ناول کا مرکزی کردار) کے شادرا اور معصومہ (ناول کے دو نسائی کردار) کے ساتھ آزاد جنسی تعامل ، ناگی کے اندر چھپی خواہش کا تخیلاتی انداز ہے۔ وہ عورت کے خدوخال کی تعریف بھی کرتے ہیں اور عورت کے روبرو ہونے سے شرماتے بھی ہیں؛ خود سپردگی کا نسائی انداز بھی اپناتے ہیں اور شعوری نفرت اور لاتعلقی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں ۔

انیس ناگی تیسری دنیا کی نفسیاتی گھٹن اور بے بسی کا اظہار کرتے ہیں ۔ ناول پتلیاں میں جمیل کی بین الاقوامی نفسیات کی کانفرنس کے سلسلے میں ٹوکیو (جاپان) کی آزادانہ فضا میں برہنہ بدنوں کی نمائش، اس کی بے بسی کو مزید ہوا دیتی ہے؛ نشے میں دھت، جمیل کے یہ جملے اسی بے بسی کے ترجمان ہیں:

علی! تم لوگوں کی جنسی زندگی کیا ہے جو پچیس تیس سالوں کے بعد شادی کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ پھر چار پانچ سالوں کے بعد یہ ایک پھیکی سی ضیافت بن جاتی ہے۔ ہمارے پاس عورت اور آدمی دو مخالف قوتیں ہیں جو پیہم مقابلے میں ہوتی ہیں۔ یہ بظاہر چند لمحوں کی بات ہوتی ہے لیکن اس کے اثرات بدن سے ماورا ہو جاتے ہیں۔ ہماری عورتیں اس بات پر اتراتی ہیں کہ ان کے بغیر مرد جی نہیں سکتے، مَیں پوچھتا ہوں، وہ مرد کے بغیر جی سکتی ہیں؟ علی تم ایک وحشی ہو، یہ ایک فن ہے جس سے یہاں کی کال گرلز ناآشنا ہیں، ان کے اندر اتنے خوفناک ٹیبوز ہیں، ان کے بدن دیکھ کر خواہش ہوا ہو جاتی ہے۔ ۳۸

انیس ناگی کے ہیرو عورت کے قرب سے نامعلوم قسم کے خوف کا شکار ہو کر دور ہٹ جاتے ہیں اور ان کے لمس کی خواہش ادھوری جاتی ہے۔ ناول محاصرہ کا ہیرو جمیل ہو یا میں اور وہ کا ''میں'' یا ناراض عورتیں کا مرکزی کردار، وہ کھل کر پیش قدمی سے کتراتے ہیں ان کرداروں کے پسِ پشت، ناگی کی اپنی شخصیت کی جھلک ملتی ہے۔ وہ خود بھی زن گریز رہے ہیں۔ عورت کی موجودگی ان کے لیے نامعلوم گھٹن کا باعث ہوتی۔ '' میرا پیچھا چھوڑ دو'' جیسی نظموں اور آپ بیتی ایک ادھوری سرگزشت اور میں عورت کے وجود سے گھبراہٹ اور جھنجلاہٹ کے رویے ملتے ہیں؛ ان کا موقف ہے:

میرے ایک نقاد نے کہا تھا کہ میری شاعری میں عورت کم سے کم دستیاب ہے اور میرے ناولوں میں بھی عورت کے روپ کو اچھے طریقے سے پیش نہیں کیا گیا۔ مَیں اس بات کو جزوی طور پر تسلیم کرتا ہوں۔ میری نظموں میں اگر کہیں عورت یا محبت کا احساس ہے تو وہ ان عورتوں کے لیے ہے جو مجھے دوسری سرزمینوں پر ملیں۔ مَیں پاکستانی عورتوں سے بے حد گھبراتا ہوں۔ ۳۹

انیس ناگی کے افسانوں میں بھی آزاد جنسی اختلاط کی خواہش ملتی ہے وہ معاشرتی امتناعات کے خلاف بغاوت کا رجحان رکھتے ہیں۔ وہ عورت کے وجود کے تمنائی ہیں لیکن قریب پاتے ہی ان سے خوفزدہ یا متنفر بھی ہو جاتے ہیں لہٰذا وہ تخیل کے دائرے میں عورت پر فریفتگی کا ارمان پورا کرتے ہیں۔ افسانہ '' زرد دھواں'' میں مرکزی کردار کی زبان سے ادا شدہ یہ خیالات اس حقیقت کے ترجمان ہیں:

عورت زندگی کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔ میں نے بھی اپنے خیالوں میں ایک درجن لڑکیوں اور عورتوں سے محبت کی ہے۔۔۔ مَیں جس دنیا میں رہتا ہوں، اس میں عورت اور آدمی کو نکاح کرائے بغیر ملنے کی

آزادی نہیں ہے جو اس کے بغیر ملتے ہیں، وہ بلاوجہ اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ عورت ایک نوع ہے اور کسی بھی عورت کو پکڑ کر اسے خصوصی بنایا جاسکتا ہے، یہ بحث پیچیدہ ہے۔[۴۰]

انیس ناگی، عورت کی نفسیات کے پارکھ ہیں؛ بالخصوص تیسری دنیا کے معاشرتی نظام میں عورت عدم تحفظ کا شکار ہے اسی بنا پر وہ مرد سے تعلق، استواری بشرطِ وفاداری کے تحت شادی، جیسے بندھن میں بندھنا ضروری سمجھتی ہے۔افسانہ'' عورت کہانی '' میں افسانہ نگار نے عورت کے اندرونی خوف اور عدم تحفظ کے رویوں کی عکاسی کی ہے۔ افسانے میں موجود یہ جملے عورت کی نفسیات کے عکاس ہیں:

مجھے بغیر دیکھے ہی یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ ملاقاتی کوئی ادھیڑ عمر کی عورت ہے کیونکہ عمر کے اس حصے میں عورتیں زیادہ اور تیز خوشبوئیں استعمال کرتی ہیں۔ یہاں ملازم پیشہ عورتیں آتی ہیں۔ ناز نخرے دکھاتی ہیں، ہر طرح سے متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن مَیں ٹس سے مس نہیں ہوتا کیونکہ یہ بناؤ سنگھار، نخرے ایک خول ہوتا ہے۔ اصل غائت کچھ اور ہوتی ہے۔ عورت ہمیشہ مطلب کے لیے ملتی ہے۔ میرے ایک دوست کے مطابق عورت کی جانب سے کی جانے والی محبت ذاتی تحفظ کے لیے پہلا قدم ہوتا ہے۔ عورتوں سے نہ ہی رشتہ جوڑا جائے تو بہتر ہے کیونکہ اس میں تنگی ہوتی ہے۔ آخر میں ہر عورت، عورت ہی نکلتی ہے جسے برداشت کرنے کے لیے بہت حوصلہ چاہیے ہے۔[۴۱]

انیس ناگی، جنسی تلذذ یا فحاشی کی طرف اشارہ کناں نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے اس کی عام زندگی کے متوازن رویوں میں اہمیت، قدر و قیمت، معنویت اور اثر و نفوذ کی طرف اشارہ کناں ہیں؛ ان کا موقف ہے کہ اس بنیادی جبلت کی عدم تشفی سے معاشرے میں تخریبی رویے پروان چڑھتے ہیں۔

انیس ناگی کے افسانوی ادب میں نفسیاتی پیچیدگیوں کا ذکر حقیقت پسندانہ اسلوب میں کیا گیا ہے۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ انھوں نے کسی خاص نفسیاتی اسلوب کا سہارا لیے بغیر، عام فہم جملوں میں کرداروں کے عمل و تعامل سے نفسیاتی الجھنوں کی گرہ کشائی کی ہے۔ انھوں نے انسان کی نفسی جذبی کیفیات، لاشعور کے قضیے، اجتماعی لاشعور کے قصے، سیدھے اور سچے انداز میں فن کے روپ میں پیش کر دیے ہیں۔ انیس ناگی کے فن کا مرکز انسان ہے اور انسان کی ذہنی کیفیات کی تشریح و تحلیل ان کے ادب کا مرکزی نقطہ ہے۔ فرد کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا تخلیقی اظہار، انھیں معاصر تخلیق کاروں سے منفرد مقام پر لا کھڑا کر دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر، تخلیق اور لاشعوری محرکات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء، ۲۱۔۲۲۔

۲۔ ڈاکٹر انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، لاہور: خالدین پوسٹ بکس، ۱۱۹۷، ایورگرین پریس، ۴۔ چیمبر لین روڈ، باراول، مارچ ۱۹۸۰ء، ص ۹۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۱۵۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۶۸۔

۵۔ ڈاکٹر انیس ناگی، چوہوں کی کہانی مشمولہ فصیلیں (چار ناولوں کا مجموعہ) لاہور: جمالیات، ۲۲ گنگا رام مینشن، مال روڈ، ۲۰۰۵، ص ۴۴۳۔

۶۔ ڈاکٹر انیس ناگی، مَیں اور وہ، لاہور: مکتبہ جمالیات، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۲۹، عالمین پبلی کیشنز پریس، ۱۹۸۴ء، ص ۲۳۔

۷۔ ایضاً، ص ۴۰۔

۸۔ ڈاکٹر انیس ناگی، پتلیاں، لاہور: جمالیات، ۲۲۔ گنگا رام مینشن، مال روڈ، ۲۰۰۱ء، ص ۴۱۔

۹۔ ایضاً، ص ۲۳۱۔

10. Carl Jung, Simple Psychology, file :///C:/user/UEATK /Desktop /carl % 20/ simple %20Psychology. html , P:3.

۱۱۔ دیوار کے پیچھے، ص ۳۳۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۷۸۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔

۱۴۔ پتلیاں، ص ۳۱۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔

۱۶۔ ڈاکٹر انیس ناگی، ناراض عورتیں، لاہور: جمالیات، ۲۲۔ گنگا رام مینشن روڈ، ۲۰۰۳، ص ۱۶۷۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۷۸۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۱۴۔

۱۹۔ ڈاکٹر انیس ناگی، قلعہ، لاہور: جمالیات،۲۲۔گنگارام مینشن، مال روڈ،۱۹۴ء،ص ۹۵۔

۲۰۔ افسانہ ’’سایہ‘‘،مشمولہ،بد گمانیاں،لاہور: جمالیات،۲۲۔گنگارام مینشن، مال روڈ،۲۰۰۱ء،ص ۹۳۔

۲۱۔ ایضاً،ص ۹۴۔

۲۲۔ افسانہ ’’حکایت ۵‘‘،مشمولہ بد گمانیاں،ص ۱۷۶۔

۲۳۔ ایضاً،ص ۱۷۸۔

۲۴۔ افسانہ ’’حکایت ۴‘‘،مشمولہ بد گمانیاں،ص ۱۷۲۔

۲۵۔ محمد اجمل، ڈاکٹر، تحلیلی نفسیات،ترتیب وتعارف، خالد سعید، لاہور: بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۹ء،

ص ۹۷،۹۸۔

۲۶۔ ناراض عورتیں،ص ۴۳۔

۲۷۔ ایضاً،ص ۵۴۔

۲۸۔ ایضاً،ص ۸۲۔

۲۹۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، ایک ادھوری سر گزشت، لاہور: جمالیات۲۲۔گنگارام میشن، مال روڈ،

۱۹۹۸ء،

ص ۱۸۳۔

۳۰۔ ایضاً،ص ۱۹۱۔

۳۱۔ دیوار کے پیچھے،ص ۵۹،۶۰۔

۳۲۔ ایضاً،ص ۱۷۶۔

۳۳۔ ڈاکٹر انیس ناگی،ایک لمحہ سوچ کا، لاہور: حسن پبلی کیشنز،حسن ولا، کرشن نگر،۱۹۹۴ء،ص ۱۵۔

۳۴۔ ڈاکٹر انیس ناگی، زوال، لاہور: فیروزسنز (باراول) ۱۹۸۹ء،ص ۴۰۔

۳۵۔ ڈاکٹر انیس ناگی، سکریپ بک، لاہور: جمالیات،حسن ولا، ہری لاج سٹریٹ، کرشن نگر، ۲۰۰۹ء،ص ۵۲۔

۳۶۔ مَیں اور وہ،ص ۱۷۳،۱۷۴۔

۳۷۔ ایضاً،ص ۱۸۷،۱۸۸۔

۳۸۔ پتلیاں،ص ۵۸۔

۳۹۔ ڈاکٹر انیس ناگی،''جھلاہٹ''،مشمولہ،میری ادبی بیاض،لاہور:جمالیات ۲۲۔گنگارام،مینشن،مال روڈ،۱۹۹۶ء،ص۱۸۰۔

۴۰۔ افسانہ''زرد دھواں''مشمولہ بد گمانیاں،ص۱۰۲۔

۴۱۔ افسانہ''عورت کہانی''مشمولہ بد گمانیاں،ص۱۰۷،۱۰۹،۱۱۰۔